بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مخدوم امیر احمد صاحب

برصغیر میں مغربی تعلیم کا نفاذ

دینی درسگاہوں کی اسلامی تعلیمات کو محفوظ رکھنے کی جدوجہد

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ اما بعد۔

صاحب صدر و معزز سامعین! مندرجہ بالا عنوان اتنا وسیع ہے کہ اس کے تفصیلی جائزے کے لئے کم از کم کئی سو صفحات کی کتاب چاہیئے۔ اور جس قسم کی کانفرنس میں ہم موجود ہیں۔ ایسی کانفرنسوں میں یہ طوالت تو درکنار اس کے عشر عشیر کی بھی گنجائش نہیں ہے اسلئے میں برصغیر کے دوسرے حصوں کو نظر انداز کرکے صرف سابق سندھ پر ہی اپنے مقالہ کو مرکوز کرتا ہوں اور جو جائزہ میں پیش کروں گا وہ بھی ایک طائرانہ جائزہ ہی تصور کرلیا جائے۔ کیونکہ میں تفصیلات کو چھوڑکر صرف مختصر اشاروں پر ہی اکتفا کروں گا اور یہ کہوں گا کہ:۔

دادیم ترا ز گنج مقصود نشاں   گر ما نہ رسیدیم تو شاید برسی

سابق سندھ برِ صغیر پاک و ہند کے مغرب میں ایک خطہ ہے جسے باب الاسلام ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ وہ مبارک سرزمین ہے۔ جس کو اس برصغیر میں سب سے اوّل اسلام کے نور سے منور ہونے کی عزت ملی اور یہاں سے اسلام کی شعاعیں اس برِصغیر کے کونے کونے میں پھیلنے لگیں۔ نوجوان مجاہد محمد ابن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے آنے سے پہلے یہاں اسلام کے سورج کی کرنیں پہنچ چکی تھیں اور اس خطّے کے کچھ حصّے اسلام سے مانوس ہو چکے تھے۔

عربوں کے آنے کے بعد دوسری صدی ہجری کی ابتدا سے ہی یہاں قرآن وحدیث کی تعلیم کا چرچا شروع ہوگیا۔ چنانچہ اسی سرزمین کے ایک باشندے نے سب سے پہلے قرآن پاک کا سندھی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ ۲۷۰ھ میں کیا گیا اور اسی عالم نے عقائد اسلام کو سندھی زبان میں اس خوبی سے نظم کیا تھا کہ پڑھنے والے پر ایک خاص قسم کا اثر ہوتا تھا۔

علامہ ربیع بن صبیح جن کا شمار قدماء میں ہوتا ہے۔ انہوں نے بھی سرزمین سندھ کو اپنا وطن بنایا تھا۔ ان بزرگ نے فنِ حدیث میں ایک جزو تالیف کیا جو "جزو ربیع بن صبیح" کے نام سے مشہور ہے۔ ایک اور عالم قاضی ابومحمد منصوری نے بھی حدیث میں کتابیں تصنیف کی تھیں۔ اس

بنا پر ہم کو دعویٰ کرنے کا حق پہنچتا ہے کہ برِّ صغیر کے اندر حدیث میں پہلی کتاب سابق سندھ میں مرتب ہوئی۔

المختصر - اسلامی علوم و فنون کا سورج۔ برِّ صغیر کے اندر سب سے اول سندھ میں نکلا۔ اور اس کی کرنیں یہاں سے اٹھ اٹھ کر ملک کے اطراف و اکناف کو روشن کرنے لگیں۔

ابتدائی دَور میں نصابِ تعلیم کیا تھا اس کا پتہ نہیں۔ البتہ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن، حدیث اور عربی زبان اور ادب کو اس زمانے میں خاص اہمیّت حاصل تھی قرآن اور حدیث کا حال تو اوپر بیان ہو چکا۔ عربی زبان و ادب کے متعلق یہ شہادت کافی ہے کہ زمانۂ زیر بحث میں سندھ میں عربی زبان کے وہ شعرا اور ادیب تھے۔ جن کا لوہا خود عربوں نے مان لیا مثلاً ابو عطا سندھی، ابو ضلع سندھی اور ہارون ملتانی جن کا قصیدہ تخزیجی نے آثار البلاد میں نقل کیا ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے۔

لقد انکر اصحابی وماذا لک بالامثل اذا ما مدح الھند وسھم الھند فی المقتل

پانچویں صدی کی ابتدا میں عربوں کی حکومت ختم ہوئی اس وقت سے لے کر نویں صدی ہجری کے نصف تک اس ملک کی تاریخ پر تاریکی کا پردہ چھایا ہوا ہے۔ نویں صدی کے آخری نصف سے حالات پھر روشنی میں آتے ہیں تو ہماری نگاہیں بڑے بڑے علماء اور فضلاء پر پڑتی ہیں جو تفسیر، حدیث اور فقہ میں مہارت تامّہ رکھتے ہیں۔ مخدوم بلال ٹلٹی۔ قاضی سائینڈ تو سیوھانی۔ مخدوم عبداللہ دربیلی اور ان کے دو بیٹے شیخ حمید اور شیخ رحمۃ اللہ اور مخدوم جعفر بوبکانی رحمۃ اللہ علیہم کے نام اس سلسلہ میں قابل ذکر ہیں۔ آخر الذکر بزرگ کی کتاب "حل العقود فی طلاق المسنود" اور "الفطانتہ فی مرمتہ الخزانتہ" فقہ میں یادگار ہیں۔ انہوں نے فن تعلیم پر بھی ایک کتاب بنام "نہج التعلم" لکھی تھی جس کا ایک خطی نسخہ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ صدر شعبۂ تعلیم سندھ یونیورسٹی کے پاس محفوظ ہے۔ اس زمانہ کے نصاب میں تفسیر، حدیث اور فقہ کے علاوہ صرف نحو، منطق وغیرہ جیسے علوم آلیہ وعقلیہ بھی شامل تھے۔ بلکہ بعض ذہین اور شوقین علماء تو فلسفہ، ہیئت، اقلیدس اور علم شعبدہ جات میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ علوم عقلیہ کے سلسلہ میں میرک کلاں، ملا عبدالخالق اور مولانا عبدالعزیز کے نام مشہور ہیں۔ علم شعبدہ جات میں مخدوم جعفر بوبکانی کو کمال حاصل تھا۔

تذکروں سے معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت کے علماء میں طب اور تصوّف کو بھی رواج

حاصل تھا۔ علوم عقلیہ کو یہاں لانے میں ان علماء کا ہاتھ تھا جو ایران سے ہجرت کر کے یہاں پہنچے تھے مگر جو فروغ اس خطہ میں علوم دینیہ کو حاصل رہا وہ علوم عقلیہ کو حاصل نہ ہو سکا۔ تعلیم و تدریس کا یہ طریقہ میروں کی حکومت تک قائم رہا اور ہر دور میں بڑے بڑے علماء، محدثین، فقہاء اور ادباء پیدا ہوتے رہے۔ جن کے نام تاریخ اور تذکرہ کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔

یہ تھا سابق سندھ کے نظام تعلیم و تربیت کا مختصر خاکہ جو بطور تمہید پیش کیا گیا۔ اب ہم اپنے مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ انگریزوں نے ۱۸۴۳ء میں میروں سے غداری کر کے اس سرزمین پر اپنے قدم مضبوط کئے اور ۱۸۵۷ء میں تحریک آزادی کو کچلنے کے بعد جب ان کے قدم پورے برصغیر میں جم چکے تو انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ اس ملک کے باشندوں کو مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگنے اور ان کے دل اور دماغ کو کلی طور پر مغرب زدہ کرنے کے لئے یہاں اپنا نظام تعلیم رائج کیا۔ یہ نظام سیکولر قسم کا نظام تھا۔ جس سے مسلمانوں کے نونہالوں کے اپنے مذہب اور اپنی تہذیب سے نہ صرف بیگانہ بلکہ بدظن ہو جانے کا قوی اندیشہ تھا۔ ہندؤں کے پاس چونکہ سرے سے کوئی نظام تعلیم تھا ہی نہیں اس لئے اس نئے نظام کو قبول کرنے میں انہیں کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا۔

انگریزوں نے دینی مدارس کی سرپرستی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور اپنے رائج کردہ نصاب کی سرپرستی اور اشاعت بڑے زور شور سے کرنے لگے لہٰذا حالات سے مجبور ہو کر مسلمان ارباب فکر اور بیدار مغز علماء اپنے قومی خصائص و روایات اور مذہبی و ملی شعائر و علامات کو قائم رکھنے کی خاطر سب سے پہلے اسلام کے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کی طرف متوجہ ہوئے کیونکہ اسی کے ذریعہ اہل اسلام اپنی قومیت اور جان سے زیادہ عزیز مذہب کا تحفظ کر سکتے اور مغلوب و محکوم ہونے کے باوجود بحیثیت ایک قوم زندہ رہ سکتے تھے۔

علماء کرام اور زندہ دل مفکرین نے سوچا کہ اگر خدانخواستہ فاتح قوم کا اثر اہل اسلام کے جسموں سے تجاوز کر کے ان کے دلوں اور دماغوں کو تسخیر کر لیا۔ اور انہوں نے اپنے ملی شعائر کو چھوڑ کر فاتح قوم کی نقالی اور کورانہ تقلید شروع کر دی تو وہ پھر کہیں کے نہیں رہیں گے اس لئے ضروری ہے کہ اسلامی اقدار اور اسلامی تعلیمات کو برقرار رکھنے کے لئے جد و جہد جاری رکھی جائے۔ کیونکہ اسلام اور صرف اسلام ہی وہ چیز ہے جس سے مسلمان زندہ رہ سکتے ہیں۔ مگر

مذہب ہاتھ سے نکل گیا تو پھر کچھ نہیں رہا۔ قوم مذہب سے ہے۔ مذہب جو نہیں تو ہم بھی نہیں۔
آخر علماء دین کی رہنمائی میں قوم آگے بڑھی اور انہوں نے اسلامی درسگاہوں کی گرتی ہوئی دیواروں کو سہارا دیا اور ان کو زندہ رکھنے کے لئے جد و جہد شروع کردی۔

انگریزوں کا تسلّط قائم ہوتے وقت سابق سندھ میں دینی علوم کے مندرجہ ذیل چھ مرکز موجود تھے، سیوھن، ٹزنیا، کہڑا، متعلون، دلہار اور چوتیاریوں انگریزی عملداری کے بعد ٹزنیا، دلہار اور چوتیاریوں کی مرکزیت ختم ہوگئی۔ باقی سیوھن، کہڑا اور متعلون بڑی شفقت کے ساتھ اسلامی تعلیمات کی اشاعت میں منہمک رہے۔ فائدہ سے خالی نہ ہوگا اگر میں یہاں کہڑا کے ایک عالم مخدوم محمد عاقل کہڑوں کے سفر بہاول پور کا ذکر کروں تاکہ اس زمانے کے علماء کے فضل و کمال اور عوام و خواص خصوصاً حکام وقت کی ان سے عقیدتمندی اور ادب و احترام کا اندازہ ہو جائے۔

مخدوم محمد عاقل جس زمانہ میں شہر کہڑا سابق ریاست خیرپور میں درس و ارشاد کی مسند پر جلوہ افروز تھے۔ اس زمانے میں سابق ریاست بہاول پور کی زمام ایالت نواب بہادر حاجی فتح محمد خان عباسی کے ہاتھ میں تھی۔ اس زمانہ میں گھوٹکی شریف اور اُچ شریف کے جیلانی پیروں کے درمیان بزرگوں کے ورثہ کی تقسیم پر جھگڑا ہو گیا۔ جھگڑا بڑا پیچیدہ تھا۔ اس لئے ریاست کے دفتر دار مولوی منظر علی صاحب مرحوم نے مخدوم محمد عاقل صاحب سے استدعا کی کہ وہ بہ نفس نفیس ریاست بہاولپور تشریف لاکر اس جھگڑے کو فیصل فرمائیں۔ جب مخدوم صاحب ریاست بہاولپور تشریف لائے۔ اور آپکی علمی قابلیت، فصاحت اور بلاغت کی آواز جناب والا جاہ کے کانوں تک پہنچی تو انہوں نے مخدوم صاحب کو اپنے یہاں مدعو کیا اور ان کے آنے پر خود بدولت نے اپنے شہر احمد پور سے تین میل باہر نکل کر استقبال کیا، ان کی اقتداء میں نماز جمعہ ادا کی اور مواعظِ حسنہ سے مستفید ہوئے۔ مولوی فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ جو بہاول پور کے بڑے عالم اور نہایت فصیح و بلیغ خطیب تھے انہوں نے مخدوم صاحب کی مدح میں کچھ قصیدے منظوم فرما کر خدمت میں پیش کئے۔ جن کے چند بند یہاں نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔ قال:-

اے ز علوم تو ملک مہتدی | خلق بہ علم تو شدہ مقتدی
دل کش تو گشتہ دل عالمی | آمدنت شد سپر ہر غمی

چوں تو نمودی سوِ ما دل کشی — ز آمدنت گشت محصل خوشی
منتظرت عالم وھم ملتجی — جئت الینا فلنعم المجی

الیٰ آخر ما قال

ولہٗ

مہ برج شریعت شمس عرفاں — درِ درجِ طریقت شمع ایقاں
محمد عاقل اندر راہِ عقبیٰ — عمیم اللطف مخدوم معلےٰ
مبارک طلعت و میموں شمائل — ھمایوں سیرت و موزوں فضائل
بلاغت منزلت تحریر علماء — رفیع المرتبت مخدوم فضلاء
رقم فرمائی تفسیر معانی — یلِ میدانِ دینِ حیاودانی
عیاں برھان بعلم فقہ و تفسیر — احادیث نبی را نیک تقریر
قریشی ھاشمی اولاد عباس — یقیں رتبہ ہیں عتبہ بیٔ ناس

الیٰ آخر ما قال

اسی زمانہ میں سکھر ضلع میں ھمایوں اور لاڑکانہ ضلع میں شہداد کوٹ میں دو نئی دینی درسگاہیں مولانا محمد یعقوب اور مولانا نور محمد صاحبان نے قائم کیں۔ ان بزرگوں کے تلمذ کا سلسلہ چونکہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا تھا اس لئے انہوں نے مروجہ نصاب، جو نصاب سمرقندی کہلاتا تھا، میں تھوڑی بہت تبدیلیاں کیں۔ مثلاً نحو کا فن جو پہلے کافیہ ابن حاجب پر ختم کیا جاتا تھا۔ اس میں شرح جامی اور عبدالغفور کا اضافہ کیا گیا اور عقائد میں خیالی جیسی دقیق اور فلسفی رنگ میں لکھی ہوئی کتاب داخلِ نصاب ہوئی وغیرہ۔ اس اضافہ سے مقصد صرف طلباء کے ذھنوں کی تشحیذ اور جلا اور سوچنے اور سمجھنے کے ملکہ اور استعداد کا مستحکم کرنا تھا۔ لیکن منطق کبریٰ سے کنارہ کشی قائم رہی۔

(یاد رہے کہ اس خطہ میں نصاب نظامی نے کبھی رواج نہیں پایا)

علامہ یعقوب اور علامہ نور محمد کے بعد ان کے فرزندوں اور شاگردوں نے سندھ کے کونے کونے میں دینی درسگاہیں قائم کیں اور اسلامی تعلیمات کو پھیلایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شہر اور ہر گاؤں میں دینی درسگاہیں قائم ہوگئیں اور جگہ جگہ قال اللہ و قال الرسول کی صدا گونجنے لگی۔ آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے مولانا عبیداللہ سندھی دیوبند سے فارغ ہوکر

سندھ تشریف لائے اور آتے ہی پہلے امروٹ میں اور بعد میں پیر جھنڈو ضلع حیدرآباد میں دارالعلوم دیوبند کے نمونہ پر مدرسہ دارالرشاد کے نام سے ایک دارالعلوم قائم کیا اس سے چند سال بعد قصبہ ٹھیڑھی ضلع خیرپور میں مولانا حبیب اللہ نامی ایک بزرگ عالم نے مدرسہ دارالہدیٰ قائم کیا یہ بھی دارالعلوم دیوبند کے نمونہ پر چل رہا ہے۔

پاکستان بننے کے بعد مولانا احتشام الحق تھانوی کی کوششوں سے ٹنڈو الہیار ضلع حیدرآباد میں دارالعلوم اشرفیہ کے نام سے ایک دارالعلوم قائم ہوا ہے جہاں کے جملہ مدرسین دیوبند کے فارغ التحصیل اور دیوبندی نقطۂ نگاہ کے داعی ہیں۔

دوسری طرف حضرت پیر صاحب پاگارو کی سرپرستی میں ان کی مساعی جمیلہ سے پیر جو گوٹھ ضلع خیرپور میں جامعہ راشدیہ کے نام سے ایک درسگاہ قائم ہوئی ہے۔ جس میں کام کرنے والے جملہ اساتذہ بریلوی سکول سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اسی قسم کی دو اور درسگاہیں مدرسہ احسن البرکات اور جامعہ مجددیہ رکن الاسلام کے نام سے حیدرآباد میں قائم ہوئی ہیں۔ چھوٹی موٹی درسگاہوں کا تو کوئی حساب نہیں جو شہروں اور دیہات میں کام کر رہی ہیں۔

یہ تو تھا دینی درسگاہوں کی تاریخ کا ایک طائرانہ جائزہ۔ اب ان کی اسلامی تعلیمات اور اسلامی اقدار کے محفوظ رکھنے کی جدوجہد کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

واضح رہے کہ ان مدارس کی بنیاد بالکل اصحاب صفہ کی تقلید میں للّٰہیت خلوص اور ایثار پر رکھی جاتی تھی۔ چنانچہ آج سے تقریباً نصف صدی پہلے جو جو علماء یہاں تعلیم دیتے تھے وہ کوئی مقرر تنخواہ یا وظیفہ قطعاً قبول نہیں کرتے تھے۔ بلکہ کسی مناسب اور موزوں مقام پر بیٹھ کر للّٰہ فی اللّٰہ درس کا سلسلہ شروع کر دیتے تھے۔ اپنی ضروریات کو محدود کر کے قوت لا یموت پر اکتفا کرنا ان کا شعار تھا۔ وہ اپنی ضروریات اس تھوڑی سی فتوحات سے پوری کر لیتے تھے جو ان کو معتقدین سے بغیر کسی سوال یا تعریض کے مل جاتی تھی بعض اوقات فاقہ کی نوبت آجاتی تھی تو بھی ان کے تعفف کا یہ حال ہوتا تھا کہ کسی سے اس کا اظہار تک گوارا نہ کرتے تھے۔ طلباء کی ضروریات بھی استاذ کی ضروریات کی طرح محدود ہوتی تھیں ان کی کفالت کا ذمہ مقامی باشندے لے لیتے تھے۔ استاذ اور شاگرد کے درمیان باپ اور بیٹے کے سے تعلقات ہوتے تھے۔ طلباء کے ہر دکھ اور سکھ میں استاذ بھی شریک رہتا تھا۔ استاذ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہوتا تھا اور ان کی رہن سہن، اٹھنا بیٹھنا، بول چال،

اوڑھنا بچھونا مطلب یہ کہ ہر چیز میں طلباء کے لئے سنت نبوی کا ایک بہترین نمونہ ہوتا تھا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ طلباء کی تربیت کی طرف خصوصی توجہ مبذول کی جاتی تھی۔ سبق میں ناغہ کو بُرا سمجھا جاتا تھا۔ اِس لئے سبق کا تواتر ان مدارس کی اولین خصوصیت تھی۔ تعلیم و تربیت کے لئے کوئی خاص وقت مقرر نہیں تھا۔ بلکہ دن رات استاذ شاگردوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اور رات کے چند گھنٹے آرام کے سوا جملہ اوقات میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ شاگرد کو سوال کرنے کی اجازت ہوتی تھی اور اس کے پیش کردہ اشکال کو بڑے غور سے سُنا اور حل کیا جاتا تھا۔ منتہی طلباء کی تعلیم میں طریق بحث و تمحیص کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ دینی درسگاہ کے استاذ اور طلباء کو عوام عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کا قول اور فعل ان کے لئے سند کی حیثیت رکھتا تھا۔ نہ فقط یہ بلکہ مدرسین علماء اور ذی استعداد طلباء تبلیغ دین اور اصلاح معاشرہ کے داعی بن کر چھٹیوں میں دور دراز مسافتیں طے کر کے گاؤں گاؤں میں جاتے اور وعظ و نصیحت کے ذریعہ معاشرہ میں پیدا شدہ خرابیوں کو دور کرنے کی سعی و کوشش کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی قائم تھا۔ سندھی زبان میں چھوٹی بڑی کتابیں اور رسالے لکھ کر عوام میں ان کی اشاعت کی جاتی تھی۔ جس کا عوام پر بڑا اچھا اثر پڑتا تھا۔ مطلب یہ کہ آج سے پچاس سال قبل تک علم دنیا کے لئے نہیں بلکہ خدائے ذوالجلال کی خوشنودی کے لئے پڑھا اور پڑھایا جاتا تھا۔ وعظ و نصیحت کی کوئی محفل قائم کی جاتی تھی تو بھی خدا تعالیٰ کی خوشنودی پیش نظر ہوتی تھی نہ جلب زر۔ کوئی کتاب لکھی جاتی تھی تو بھی رضائے الٰہی سامنے ہوتی تھی نہ جلب منفعت۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام، علماء اور طلباء کے راہ میں آنکھیں بچھاتے تھے۔ ان پر جان تک قربان کرنا اور ان کے ہر اشارہ کی تعمیل اپنے لئے فرضِ عین سے کم نہیں سمجھتے تھے۔

افسوس کہ جب سے مدارس میں تنخواہ پانے والے معلّم تعلیم دینے لگے۔ علماء میں وہ ایثار نہ رہا اور طلباء کی نیتوں میں فتور آگیا تو وہ بات قریب قریب ختم ہو گئی اور آج دینی مدارس کی حالت یہ ہے کہ جسم تو موجود ہے۔ لیکن جان نہیں ہے۔ اس موقعہ پر شاہ عبداللطیف بھٹائی کا ایک سندھی اور مولانا جامی کا فارسی شعر لکھ کر مقالہ کو ختم کرتا ہوں۔

شاہ لطیف:- اڄ نہ اوطاقن ۾ طالب تنواري　　آديسي اٿي ويا مڙهيون مون ماري
جي جيءَ کي جيارين سي لاهوتي لڏي ويا

مولانا جامی :-

حریفاں بادہ ہا خوردند رفتند
تہی خمخانہ ہا کردند رفتند

کتابیات

اس مقالہ کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔

۱- نزہتہ الخواطر	مولانا عبدالحی
۲- تاریخ معصومی	میر معصوم بکری
۳- تحفۃ الکرام	میر علی شیر قانع
۴- تاریخ سندھ	ابوظفر ندوی
۵- مقالات الشعراء	میر علی شیر قانع
۶- تکملہ مقالات الشعراء	مخدوم ابراہیم خلیل
۷- الوحید آزاد نمبر	
۸- سندھ (انگریزی)	برٹن
۹- شاہ عبداللطیف آف بھٹ	سورلی
۱۰- تذکرہ مخادیم کھہڑا	مخدوم اللہ بخش
۱۱- تاریخ آئینہ جہاں نما	مخدوم محمد عاقل

یونیورسٹیوں کی دینی خدمات

جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب
(شیخ التاریخ)
حضرت مولانا عبدالقدوس صاحب
صدر شعبۂ اسلامیات۔ پشاور یونیورسٹی